شعیب شاداب
لیکچرار اُردو،
گورنمنٹ عطا شاد ڈگری کالج تربت، بلوچستان

عطا شاد: سوانح اور ادبی وفنی خدمات

Ata Shad belong to Baluchistan. He is a well known poet, researcher, and dramatist. His fun spread over and is widely appreciated. His services to Urdu literature are widely published and also gain vast appreciation. This paper describes his services and contribution for literature in detail.

خاندانی پس منظر:

آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے مکران میں بلوچوں کی موجودگی کا سراغ تو ملتا ہے لیکن بلوچوں کی بڑی تعداد نے دسویں صدی عیسوی میں اُس وقت ایران سے ہجرت کی تھی جب سلجوقیوں نے کرمان میں اُن پہ حملے کر کے اُن کی آبادیوں کو تاراج کیا تھا۔کوہ البرز سے آکر ایران کے شمال مغرب میں بسنے والی بلوچ قوم کے اکثر قبائل نے باقاعدہ چودھویں صدی میں میر جلالان کی سربراہی میں وہاں سے ہجرت کر کے مکران کے ساحلی اور پہاڑی علاقوں کو اپنا مسکن بنا لیا،اُسی عہد میں اُن کے ساتھ ایران کے موجودہ صوبے لرستان سے ایک خانہ بدوش اور اپنے پیشوں پہ دل و جان سے فدا ہونے والا پیشہ ور قبیلہ، جولُری کے نام سے جانا جاتا ہے ،بھی اپنی خاندانی اور روایتی پیشے ترکھان، لوہار، لکڑہار، سوناراور موسیقاری کے ساتھ ہجرت کر کے مکران کے ساحلی علاقوں میں وارد ہوااور مختلف ادوار میں الگ الگ گروپ کی شکل میں روزگار کی تلاش میں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ رواں دواں رہا اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں آباد ہوگیااور بعد میں کثرت استعمال سے اُس قبیلے کا نام جو اپنے آبائی مقام سے نسبت رکھتا تھا، لُری سے بگڑ کر لوڑی بن گیااور اُستا کے نام سے بھی جانا جانے لگا۔بلوچ قبائل کے ناموں کے حوالے سے اُن کے آبائی مقام کا عنصر بھی شامل ہے ۔بلوچ قبائل پر تحقیق کرنے والے مغربی محقق م۔ک پیکولین کے مطابق اکثر قبائلوں کے نام جغرافیہ سے نسبت رکھتے ہیں:

> ''بلوچ قبائل اور ان کے فرقوں کے نام یا تو اُن جگہوں کے جغرافیائی ناموں سے لیے گئے تھے، جس مقام سے ایک قبیلہ نے موجودہ علاقے تک نقل مکانی کی تھی یا قبیلے کے اصل سربراہ کے نام پر رکھے گئے تھے، یا پھر اُن کے القاب اور ناموں سے موسوم ہوئے جو ایک دوسرے پڑوسیوں کی طرف سے رکھے گئے تھے''۔ا

مکران ڈویژن کے قدیم تہذیبی ضلع ،کیچ کے شہر تربت کے ایک قصبہ سنگانی سر، جو شہر سے شروع ہوکر شمال مشرق کی طرف شہر کے عقب میں بہنے والی دریائے کیچ کور کے کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی قصبے کے اندر اُستا کارانی بازار کے ایک کچے مکان میں اپنے آباواجداد کے روایتی پیشہ سونار سے وابستہ اُستالال خان کا خاندان بستا تھا جس کا تعلق اُستا قبیلے

سے تھا۔

ولادت :

سنگانی سر کے اُسی استا کارانی بازار کے سونار اُستا لال خان کے کچّے مکان میں عطا شاد کی ولادت ہوئی جس کا نام محمد اسحاق رکھا گیا۔ میٹرک کی سرٹیفکیٹ نمبر 27891 کے مطابق نام عطا محمد اور تاریخ پیدائش 10 نومبر 1938ء درج ہے۔ اور جب لڑکپن میں تعلیم حاصل کرانے کی غرض سے اُن کے والد اُستا لال خان انہیں اسکول لے گئے تو اسکول کے اُستاد نے داخلہ دینے سے پہلے ہی اُن کا نام محمد اسحاق سے تبدیل کر کے عطا محمد رکھا اور بعد میں انہوں نے خود عطا محمد سے اپنا نام بدل کر عطا شاد رکھا۔ اپنے نام کے حوالے سے وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں :

''عطاؔ میرا نام اسکول میں پڑا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ داخلے کے وقت اتفاق ایسا ہوا کہ محمد اسحاق نام کے دو تین لڑکے اور تھے، تو ایک آدھ کو تو آپ اسکول میں کہہ سکتے ہیں ناں کہ اسحاق نمبر ایک یا اسحاق نمبر دو، سب کو تو نہیں کہہ سکتے، تو اُس وقت کے میرے جو استاد تھے، انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اِس کا نام Change کریں۔ مقصد تو پڑھنا تھا، سو میرے والد نے کہا ٹھیک ہے، آپ کوئی نام بتائیں؟ انہوں نے ''عطا محمد'' رکھا، پھر ہوتے ہوتے شادؔ ہو گئے۔ جب شاعری کا دور آیا تو پھر عطا شادؔ ہو گیا'' ۔۲

اُن کی والدہ کا نام زینب تھا اور اُن کی دو بہنیں تھیں جن کے نام ساحرہ اور صابرہ تھا اور ایک بھائی جس کا نام یعقوب تھا جسے گھر میں پیری کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس کو شدید قسم کی بیماری لاحق تھی، عطا شاد انہیں علاج کی غرض سے کوئٹہ لے گئے جو وہاں انتقال کر گئے اور اُنہیں کوئٹہ میں دفنایا گیا۔ اس سے پہلے اُن کی والدہ بھی کوئٹہ میں انتقال کر گئی تھی اور انہیں بھی کوئٹہ میں دفنایا گیا تھا۔ عطا شاد کی والدین اور بھائی بہنیں سب اُن سے پہلے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش اور سنِ ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے جسے اکثر لکھاری حضرات غلط لکھتے رہے ہیں جب کہ راقم کو تحقیق کے دوران دستاویزی ثبوت ملے ہیں جن سے اُن کی اصل تاریخ پیدائش تصدیق کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا ہے۔

بچپن:

انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ پُر امن قصبے کی تنگ اور کچّی گلیوں پر مشتمل ایک غریب پیشہ ورانہ خاندان کا عام فرزند تھا۔ ایک نہایت غریب گھرانے میں گزرا ہوا بچپن جس میں کیا کیا خواب ہوتے ہیں اور کیسی کیسی خواہشیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان کو حقیقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ میری چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور بڑے سے بڑے تقاضوں کے راستے میں کوئی دیوار اور رُکاوٹ نہ ہو۔ کوئی کیوں اور کیسے کہنے والا نہ ہو۔ ایسے وقت میں بچے اپنے ہمعصروں سے اُن کی معاشی حالت جانے بغیر موازنہ اور مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام خواب و خواہشات عطا شاد کے دل میں حسرت بن کر رہ گئے اور آہستہ آہستہ وہ بچپن اور لڑکپن کی حدود عبور کر کے جوانی کی طرف بڑھنے لگے۔

وہ اپنے بچپن کے دوست اور ہم جماعتوں کے ساتھ پنجگور کے رہائشی ماسٹر ابوبکر کے مکان میں اُن کے ساتھ رات گئے تک اکھٹے بیٹھ کر امتحان کی تیاریاں کرتے رہتے اور پڑھائی کی تھکن سے چور ہوکر سب رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ عبدالحمید لعل محمد جو کہ عطاشاد کے بچپن کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے۔ اُنہی دنوں کی مناسبت سے وہ لکھتے ہیں:

''اُس زمانے میں طلباء میں پڑھائی کا رجحان بدرجہ اتم موجود تھا۔ ماسٹر ابوبکر اُس وقت ہائی سکول تربت میں متعین تھے۔ وہ اسی سال پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ اور ہمیں ساتھ بٹھا کر ہماری مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم اُن کے مکان میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ بات بہت پرانی ہے۔ سخت سردی تھی، قریب والے ساتھی پڑھائی ختم کرکے رات گئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میرے اور عطاشاد کے گھر کافی فاصلے پر تھے۔ ہم اُس رات نہ جاسکے۔ ماسٹر صاحب کے کمرے میں بستر بھی مختصر یعنی صرف دو ہی تھے۔ ایک بستر ان کے زیرِ استعمال تھا۔ دوسرے پر میں سوگیا۔ عطاایک کرسی پہ بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ میں اس کرسی پر ایک انگریزی نیند کروں گا۔ مجھے پتا تھا کہ اس کرسی پہ اُس کو اِس قیامت خیز سردی میں نیند آئے گی کہاں! میں نے ازراہ شرارت اپنے بستر پر چُپ سادھ لی۔ تھوڑی دیر سردی کی شدّت سے اُس کا تن بدن کانپنے لگا۔ وہ میرے سرہانے آکر مجھے ٹٹول ٹٹول کر آواز دینے لگا'' اٹھو! مجھے ایک لحاف دو، میں سردی سے مرگیا''۔ لیکن میں بالکل ہی خاموش رہا اور شدت سردی سے کانپتا جارہا تھا۔ اور میں گرم بستر میں دبے منہ ہنستا جارہا تھا۔ اتنے میں ماسٹر ابوبکر صاحب جاگ اُٹھے۔ ان کی مدد سے مجھ سے ایک رضائی چھین کر عطا کو دے دی گئی۔ اور وہ تھے کہ مسکراتے اور ہنستے جارہے تھے''۔۳

وہ مطالعے کے شوقین تھے ان کے پھوپھی زاد بھائی حاصل خان جو کتابیں کوئٹہ سے اپنے ساتھ لاتے تھے عطاشادان سے وہ کتابیں لے کر پڑھتے تھے۔ اوراسی طرح بچپن ہی میں اُن کے اندر علمی اور ادبی رجحانات میں دلچسپی پیداہونے لگا کیونکہ انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کا موقع بچپن ہی سے میسّر تھا۔ وہ تعلیم سے دلی شغف رکھتے تھے۔ ان کا سارا بچپن مکران میں علم کی تلاش میں گزرا، تربت سے مڈل تک تعلیم پانے کے بعد وہ میٹرک کے لیے پنجگور چلے گئے۔

ازدواجی زندگی:

17 اپریل 1967ء کو 29 برس کی عمر میں اپنی خاندان سے باہر کوئٹہ میں بلوچوں کے ایک شریف متوسط لہڑی قبیلہ میں اُن کی شادی ہوئی ہے۔ لہڑی قبیلے کی مادری زبان براہوئی ہے البتہ وہ بلوچی بھی بولتے ہیں اور کوئٹہ میں ایک بااثر، کاروباری اور علمی حیثیت کا حامل قبیلہ مانا جاتا ہے۔ ان کی شادی دوران ملازمت کوئٹہ میں محمد بخش لہڑی کی صاحبزادی مینا لہڑی سے انجام پائی تھی۔ عطاشاد نے پسماندگان میں ایک بیٹا جس کا نام حمّل ہے اور دو بیٹیاں رُشنا اور مہنا اور اپنی بیوہ مینا لہڑی کو چھوڑا ہے جو کوئٹہ میں رہائش پذیر ہیں۔ اور اُن کے تمام بچے شادی شدہ ہیں۔ مہناشاد کی شادی عطاشاد کی زندگی میں انجام پائی تھی اور رُشنا

شادکی شادی عطاشادکی وفات کے دوبرس بعد ہوئی جبکہ اُن کے بیٹے حمل شادکی شادی اسی سال ستمبر 2012ء میں انجام پائی۔اپنی ادبی ،سرکاری اور دوستوں کی صحبت کے مصروفیات میں وہ اس قدر کھوئے رہتے تھے کہ اپنی فیملی کو نہایت ہی کم وقت دیتے تھے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنے بچّوں کی دیدار سے قاصر رہے ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ اُن کے بارے میں ہونے والے ایک سروے میں بلوچی زبان میں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ:

''کئی دنوں سے میں ایک عجیب احساس میں مبتلا ہوگیا تھا جیسا کہ میں اپنے بچّوں کواور بچّے مجھے بھول گئے ہیں۔تب میں نے محسوس کیا کہ یہ غلط بات ہے کہ میں رات کو دیر سے گھر جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ بچّے سورہے ہیں اور جب صبح دیر سے جاگتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ بچّے سکول گئے ہیں۔اِس طرح تو نہ ٹھیک طرح باپ بچّوں سے ملتا ہے نہ بچّے باپ سے۔تب میں نے دیکھا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔اب میں رات کو جلدی گھر جاتا ہوں اور شام کو بچّوں کو گاڑی میں بٹھا کر تفریح کے لیے نکلتا ہوں تا کہ اُنہیں یہ احساس تو ہوجائے کہ ہمارا کوئی باپ بھی ہے''۴

اپنی خانگی ذمہ داریوں کا جب انہیں احساس ہوا تب وہ اپنی فیملی کو زیادہ وقت دینے لگے اُن کو اپنے بیوی بچّوں سے عقیدت کی حدتک محبت تھی اور اُن کی تعلیم اور پرورش پر کوئی کسر باقی نہیں چھوڑا۔انہوں نے اپنی دوسری شعری تصنیف ''برفاگ'' کوخودترتیب دیا تھا جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی جسے انہوں نے اپنی شریک حیات ''مینا کے نام'' منسوب کر دیا تھا اور ساتھ ہی اپنے بچوں کی عرفیت منو،شنواورملو بھی لکھے ہیں۔گھر میں انہیں پیار سے انہی ناموں سے پکاراجاتا تھا۔جس طرح وہ اپنے بچوں سے پیارکرتے تھے اُسی طرح اپنی نواسی سحار سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔جن کا ذکروہ ہرجگہ دوستوں کی محفلوں میں برملاکرتے تھے۔

وفات :

انہوں نے بچپن اور لڑکپن تو مکران میں گزارے لیکن جوانی سے لے کر موت کی آغوش تک وہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں رہے اور وہاں کے ہوکر رہ گئے۔ زندگی کی 59 سال 8 مہینے اور 3 دن گزارنے کے بعد بھی انہیں کوئی جسمانی مرض لاحق نہیں تھا البتہ زمانے کی ستم ظریفی سے تنگ آ کرحرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے 13 فروری جمعرات سوا نو بجے شب اپنی سرکاری رہائش گاہ انسکمب روڈ کوئٹہ میں انتقال کر گئے۔ 14 فروری 1994ء جمعتہ لمبارک صبح 10 بجے کاسی قبرستان کوئٹہ میں ہزاروں سوگواران کی موجودگی میں اُن کی تدفین عمل میں لائی گئی۔

اُن کے کئی ہمعصر اُن کی موت کی وجہ کثرت مَے نوشی کو گردانتے ہیں البتہ اُن کی اہل خانہ کے مطابق انہوں نے اپنی موت سے دو دن پہلے شراب نوشی بھی نہیں کی تھی۔ شاید یہی ترکِ مَے نوشی ہی اُن کی موت کا باعث بنی ہو۔ البتہ ادبی حلقوں میں عطاشاد کے موت کا سبب ابھی تک مبہم ہے۔

اُن کی وفات کے بعد بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے زیر اہتمام فروری 1998ء میں ان کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس کے مہمان خصوصی اُس وقت کے وزیراعلیٰ بلوچستان سردار اختر مینگل تھے جنہوں نے اپنے خطاب میں عطاشاد کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دے کر اُن کے اعترافِ فن اور اُن کے اہل خانہ کو معاشی سہارا اور امداد کے لیے نہ صرف 5 لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا تھا بلکہ اُن کی بیٹی رُشناشاد کو حکومتِ بلوچستان کے محکمہ سوشل ویلفیئر میں گریڈ 16 کی ایک سرکاری اسامی پر تعینات کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اور ایک سرکاری مکان الاٹ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ عطاشاد کے اہل خانہ موجودہ سرکاری مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔

سابق وزیراعلیٰ بلوچستان سردار اختر مینگل کی جانب سے اس اعلان کے بعد عطاشاد کے چند دوستوں نے اسی سرکاری مکان کو اُس کی بیٹی رشناشاد کے نام الاٹ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ چونکہ وہ مکان سیکرٹری رتبے کے حامل سرکاری افسران کے لیے ہوتا تھا اسی لیے بعد میں انہیں ایک چھوٹا سا سرکاری مکان لاٹ کر کے دیا گیا۔

تعلیم:

اُن دنوں تربت میں صرف مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر میں صرف ایک ہی پرائمری سکول قائم تھا جو بعد میں ہائی سکول کا درجہ اختیار کر گیا۔ وہاں کا معاشرہ کافی غربت کا شکار تھا۔ صرف تربت شہر کے لوگ ہی آسانی سے میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکتے تھے یا وہی طلبا جو آس پاس کے قصبوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے رشتہ دار وغیرہ تربت شہر میں مقیم تھے تو وہ شہر آ کر اُن کے ہاں رہ کر دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کراچی یا کوئٹہ جا کر ہاسٹل کے بجائے اپنے رشتہ داروں کے گھروں میں رہ کر تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم پاتے تھے۔ جو لوگ مزید تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش نہیں رکھتے تھے تو وہ میٹرک کے بعد فارغ رہ جاتے تھے اور اپنے لیے نوکریاں تلاش کرتے تھے۔ اسی لیے عطاشاد کو تربت شہر ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنا پڑا۔ مکران کے اُس وقت کے تعلیمی ماحول کے بارے میں ڈاکٹر عرفان احمد بیگ لکھتے ہیں:

> ''عطاشاد جب چھٹی جماعت سے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رہے تھے اُس وقت تک مکران میں ایک ایسی نوجوان نسل تیار ہو چکی تھی جس نے کراچی کے کالج اور یونیورسٹی میں ڈگری سطح تک تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ وہ مکران کے صاحب حیثیت گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی لیکن ساتھ ساتھ متوسط طبقے کے کچھ نوجوان بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو چکے تھے مکران کے نوجوانوں کا یہ گروپ عطاشاد سے عمر کے اعتبار سے دس بارہ برس سینئر گروپ تھا۔ اس گروپ میں جو نوجوان تربت سے ابھر کر بعد میں پاکستان کی پارلیمانی سیاست میں بڑا نام بنا اور پورے ملک میں پہچانا جانے لگا وہ عبدالباقی بلوچ تھا جس نے اپنی تعلیم کراچی سے مکمل کی تھی''۔۵

اُن پر اُس وقت کے مکران کے تعلیمی ماحول کے گہرے اثرات پڑ چکے تھے اور انہیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا لیکن ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنے کی بناء پر انہیں کو یہ سہولیتں دستیاب نہیں تھیں اور نہ ہی کوئٹہ یا کراچی میں

اُن کا کوئی عزیز و اقارب مقیم تھا۔ بارہ سال کی عمر میں تربت سے آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ پنجگور چلے گئے۔ ان دنوں پنجگور میں ہائی سکول قائم تو تھا، لیکن کسی بورڈ کے ساتھ الحاق نہیں تھا۔ آج کل کے ماڈل ہائی سکول تربت کا نام اُس وقت گورنمنٹ بائی خان ہائی سکول تھا جو والی مکران کے نام پر تھا۔اور اُس کا الحاق پنجاب بورڈ کے ساتھ تھا۔ پنجگور ہائی سکول سے میٹرک کے طلباء بائی خان گورنمنٹ ہائی سکول تربت میں میٹرک کا امتحان دیتے تھے۔

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن پنجاب کی جاری کردہ سرٹیفکیٹ کے مطابق انہوں نے 1956ء میں بائی خان ہائیسکول تربت مکران سے رول نمبر52050 کے تحت انگلش، تاریخ و جغرافیہ، میتھی میٹکس، پرشین اور اردو مضامین کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔''میٹرک کے بعد انہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے اورانجینیئر بننے کی غرض سے اینمل سیکنڈری کالج لاہور میں داخلے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے'' ۱؎ پھر بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ چلے گئے لیکن اُن کے شاعرانہ وجود نے انہیں سائنس کے بجائے آرٹس پڑھنے پر اصرار کیا۔ایک سال خراب کرنے کے بعد انہوں نے باقاعدہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ایف اے میں داخلہ لے لیا اور 1960ء میں ایف اے کرنے کے بعد اُسی کالج میں گریجویشن میں داخلہ لے لیا جو کہ پنجاب یونیورسٹی سے ملحقہ تھا۔یونیورسٹی آف پنجاب کی جاری کردہ سرٹیفکیٹ کے مطابق انہوں نے رجسٹریشن نمبر60.sq.5 کے تحت گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے جون 1962ء میں جنرل اسٹڈیز میں بیچلر آف آرٹس کا امتحان دوم درجے میں پاس کیا تھا۔

گریجویشن کے بعد انہوں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا مگر ڈگری مکمل کرنے سے پہلے پڑھائی چھوڑ دی۔ جس کی وجہ غالباً نوکری تھی کہ وہ مزید پڑھائی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اسی حوالے سے پروین شاکر کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں بھی وہ اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ''اردو میرا مضمون رہا ہے''۶ جبکہ اختر علی خان بلوچ اس حوالے سے لکھتے ہیں :

> ''گریجویشن کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں بطور پروگرام پروڈیوسر تعینات ہوگئے، ملازمت کے دوران ہی شام کی کلاس میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا، انتہائی ذہین اور پختہ کار شاعر ہونے کی وجہ سے کلاس میں تنقید اور بار بار سوال کرنے کے باعث استاد نے کہا تم بغیر کلاس میں بیٹھے امتحان میں پاس ہوسکتے ہو۔ اس پر وہ اُس دن کے بعد کلاس میں نہ گئے۔اور اسی سبب وہ ایم اے نہ کر سکے''۔ ۷

راقم کو تحقیق کے دوران ایسے بے شمار مضامین ملے جن میں عطاشاد کی تعلیمی کوائف کے بارے غلط معلومات درج تھے۔جن کی تحقیق کے دوران تصدیق نہ ہوسکی۔ کچھ لکھاریوں نے اپنے مضامین میں اُن کی تعلیمی قابلیت ایم اے لکھا ہے جبکہ دوران تحقیق یہ بات افشاں ہوگئی ہے کہ انہوں نے ایم اے مکمل نہیں کیا تھا بلکہ داخلہ لینے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔

پیشہ ورانہ مصروفیات:

اپنی محنت اور قابلیت کی بدولت وہ بلوچستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں ۔ وہ اپنے پیشے سے محبت کرتے تھے

اور اپنے فرض کو عبادت کے طور پر سرانجام دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران بہت سے ترقیاتی کام بھی کروائے تھے۔اُن کے ہم پیشہ اور دوسرے لوگ جو اُن کے ماتحت کام کرتے تھے وہ انہیں ایک اچھے اور مخلص سرکاری افسر کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ایک بیوروکریٹ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ نہ صرف اچھا برتاؤ کرتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اور خردونوش بھی کرتے تھے۔وہ ہمیشہ اپنے ماتحت ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور مشکل وقت میں ان کی راہنمائی اور مدد بھی فرماتے تھے۔حتیٰ کہ ان کی بیوروکریسی ، ترقی پسند نظریات کی وجہ سے وہ سیاستدانوں کی طرف سے زیرِعتاب بھی رہے اور کئی مرتبہ اُن کا تبادلہ بھی سیاسی اختلافات کی بنیادوں پر عمل میں لایا گیا تھا۔لیکن وہ کبھی بھی سیاستدانوں کے ایسے رویوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی اُن سے شکوہ اور گلے کرتے۔

کوئٹہ میں ریڈیو نشریات کا آغاز 1956ء میں ہوا جس میں عطا شاد نمایاں ہوکر سامنے آئے ۔انہوں نے بہ حیثیت مترجم ریڈیو میں قدم رکھا جب انہوں نے دیکھا کہ وہ بلوچی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرسکتے تو صداکاری کرنے لگے۔یہ 1957ء کی بات ہے کہ اُن دنوں میر گل خان نصیر، میر شیر محمد مری، محمد حسین عنقا اور غلام محمد شاہوانی ریڈیو سے وابستہ تھے۔یہ ان کے کالج کے طالب علمی کا زمانہ تھا جب وہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں بلوچی سیکشن کے پروگراموں میں حصّہ لیتا رہا۔تعلیم سے فارغ ہوکر باقاعدہ ریڈیو سے وابستہ رہے اور بطورِ صداکار، پروگرام پروڈیوسر اور مختلف حیثیتوں سے 1962ء سے لے کر 1969ء تک کام کرتے رہے۔اُن کے پروگرام ''لشکؤ'' کو بے حد پزیرائی ملی تھی۔ اس کے علاوہ بے تحاشہ بلوچی ڈرامے اور دیگر عنوانات پر دلچسپ اور بامقصد پروگرام پیش کرتے رہے۔ریڈیو میں اُن دنوں کل پاکستان مشاعرے ہوتے تھے جہاں انہوں نے اپنی بلوچی غزل'' دلِ ءِ اشکریں کتاب ءَ'' پہلی بار ریڈیو مشاعرے میں پڑھا تھا۔ ریڈیو میں ریکارڈنگ کے لیے آنے والے بلوچی کلاسیکل گلوکاروں سے بلوچی کلاسیکل شاعری سُن کر انہیں ایک رجسٹر میں درج کرتے رہے۔اسی طرح انہیں بلوچی کلاسیکل شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوئی اور پھر بلوچی کلاسیکل شاعری سے وابستگی پیدا کرکے اپنی اردو اور بلوچی شاعری میں کلاسیکل آہنگ کو اپناتے رہے۔انہی دنوں جب ریڈیو پاکستان کراچی سے جو بلوچی گیت نشر کئے جاتے تھے وہ بہت روایتی تھے۔عطا شاد جب ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں پروڈیوسر بنے تو انہوں نے اس جانب خاصی توجہ دی انہوں نے بلوچی موسیقی کو نئے آہنگ دیئے اور گیت نگاری اور طرز نگاری کے نئے تجربے کئے۔ بلوچی کے کئی نامور کلاسیکی گلوکاروں اور موسیقاروں جن میں فیض محمد بلوچ، مرید بلیدی، شکیل خان، مُلّا موسیٰ ،محمد ہاشم اور دوسرے فنکاروں کو بلوچی موسیقی کے پروگراموں میں ریکارڈنگ کرواکر نشر کرتے رہے اور اُن کی حوصلہ افزائی اور فن کی آبیاری کرتے رہے تاکہ نوآموز گلوکاروں اور موسیقاروں کی رہنمائی ممکن ہوسکے۔خاص کر قدیم بلوچی شعراء جن میں مُلّا فاضل، جام درّک، جوانسال بگٹی اور دوسرے شعراء کے شعری سرمایہ کو نامور کلاسیکی گلاکاروں کے ذریعے ریکارڈنگ کروانا اُن کی بیش بہا خدمات میں شامل ہیں۔

اپنی تعلیم کے دوران ہی 1962ء میں وہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بطور اناؤنسر منسلک رہے اور گریجویشن کرنے کے

بعد باقاعدہ بطور پر پروڈیوسر تعینات ہوئے اور بلوچی ثقافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے رہے ۔ریڈیو کے ذریعے بلوچی کلاسیکل شاعری اور ڈرامہ نگاری کی ترویج ان کی ترجیحات رہی ہیں۔''سات برسوں تک ریڈیو پاکستان میں ملازمت کرنے کے بعد 1969ء میں انہیں محکمہ اطلاعات ونشریات میں بحیثیت انفارمیشن آفیسر تقرر کیا گیا اور انہیں ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں تعینات کیا گیا۔جہاں سے چند ماہ بعد ان کا تبادلہ پشاور کردیا گیا اور بعد میں کوئٹہ آ گئے''۔ ۹

9جون1972ء کو اس وقت کے گورنر بلوچستان میرغوث بخش بزنجو نے عطاشاد کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں بلوچستان میں محکمہ تعلقات عامہ میں ڈائریکٹر تعینات کیا۔ انہوں نے محکمہ اطلاعات کو اپنی اہلیت اور صلاحیتوں سے عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق سرگرم اور فعال بنایا۔''مئی 1973ء میں وہ محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ترقی پاکر پاکستان آرٹس کونسل کوئٹہ میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔9جون1982ء میں انہیں پاکستان آرٹس کونسل کے عہدے سے ہٹا کر پھر سے ناظم تعلقات عامہ میں بطور ڈائریکٹر تعینات کردیا گیا۔دسمبر1986ء میں وہ محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ترقی پاکر سیکرٹری اطلاعات کھیل و ثقافت تعینات ہوئے۔1988ء میں انہیں سیکرٹری اطلاعات کھیل اور ثقافت کے عہدے سے ہٹا کر سیکرٹری جنگلات بنادیا گیا۔ اُس زمانے میں انہوں نے کوئٹہ کی مغربی پہاڑیوں کے درمیان کرخہ میں ایک خوبصورت تفریحی پارک قائم کروایا''۔ ۱۰

1989ء میں انہیں دوبارہ محکمہ اطلاعات وکھیل ثقافت کا سیکریٹری تعینات کردیا گیا۔ اس دوران بلوچستان کے وزیراعلیٰ نواب اکبر بگٹی تھے۔''1990ء میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کوئٹہ میں کیا گیا تھا۔جس میں پاکستان کے نامی گرامی شعرا شریک تھے۔اس مشاعرے میں عطاشاد شراب کے نشے میں دھت تھے اور اپنے سرکاری منصب کو بھول کر بے تکلف دوستوں کی طرح پیش آئے تو نواب نصراللہ خان جو خود ایک اچھے شاعر تھے وہ وزیراعلیٰ نواب اکبر خان بگٹی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ عطاشادلڑکھڑاتے ہوئے اسٹیج سے دومرتبہ اُٹھے اور ان بزرگ سیاستدانوں کو بازو سے پکڑکر اسٹیج پرلانے اور شعر سنانے کی فرمائش نشے میں ڈولتے ہوئے غیرشائستہ انداز میں کی۔ اس مشاعرے میں عطاشاد کے بدمست ہونے پر تین روز کے اندر وزیراعلیٰ نواب اکبر خان بگٹی نے عطاشاد کو اوایس ڈی ''افسر بکارخاص'' بناکر اس عہدے سے ہٹادیا''۔ ۱۱

''اگست 1990ء میں انہیں ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ تعینات کیا گیا وہاں انہوں نے بلوچستان سے متعلق ایک صدی پر محیط انگریزوں کے لکھے ہوئے ایڈمنسٹریشن رپورٹس اور دیگر اہم دستاویزات کو زیورطباعت سے آراستہ کیا۔ 1993ء میں نواب ذولفقارعلی مگسی وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے دوبارہ انہیں صوبائی سیکریٹری اطلاعات تعینات کردیا ۔اس دوران عطاشاد سے ایک غلطی ہوئی کہ انفارمیشن کے محکمہ کے لئے ایک ویگن خریدنے کے لئے ٹینڈر ہوئے۔ اُن کے کسی دوست نے کسی ٹھیکدار کو متعارف کروایا اور کہا کہ پہلے پے منٹ کردیں اور بعد میں ویگن کی ڈیلوری ہوجائے گی۔عطاشادکو یہ بتایا کہ یہ شخص مالی طور پر تباہ ہوگیا ہے۔ پیسے ملتے ہی یہ ویگن خرید کر محکمے کے حوالے کردے گااور اس کو کچھ رقم نفع مل جائے گی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔لیکن وہ شخص رقم لے کر غائب ہوگیا۔ یوں عطاشاد کی سروس میں پروموشن

پر پابندی لگادی گئی اور اُن کو سیکرٹری کے عہدے سے ہٹا کر دوبارہ ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ تعینات کر دیا گیا''۔ ۱۲

وہ 1994ء تا 1995ء ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ کے عہدے پر فائز رہے۔1995ء تا اکتوبر 1996ء میں انہیں پھر سے چند مہینوں کے لیے سیکریٹری اطلاعات تعینات کر دیا گیا۔1996ء میں وفات سے کچھ عرصہ قبل ان کو پھر سے ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ تعینات کیا گیا اور 13 فروی 1997ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے اور اپنی خدمات سرانجام دیئے۔اُن کی کل سرکاری ملازمت کی مدّت 34 سال گیارہ ماہ رہی ہے۔عطاشاد کی پیشہ وارانہ زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے ہیں اور انہوں نے اُن کا جوان مردی سے مقابلہ کیا ہے۔کبھی اُن کو سیاسی، کبھی سماجی اور کبھی لسانی تعصب اور کبھی نظریاتی اختلافات کی وجہ سے زیرعتاب رکھا گیا ہے ۔مگر وہ نہ کبھی ان رویوں سے گھبرائے ہیں اور نہ ہی کسی کا شکوہ کیا ہے۔

تصانیف:

وہ بلوچی اور اردو کے کم و بیش گیارہ شعری اور نثری کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔مگر کچھ محقق اپنی طرف سے مفروضے قائم کرتے ہیں کہ وہ بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔لیکن راقم کو تحقیق کے دوران صرف اُن کے گیارہ تصانیف و تالیفات کا سراغ ملا ہے۔ اُن کا پہلا اردو شعری مجموعہ ''سنگاب'' اُن کی زندگی میں ہی شائع ہوچکی ہے جبکہ دوسرا شعری مجموعہ'' برفاگ'' ان کی وفات کے بعد منظرعام پر آئی ہے۔اُن کی بلوچی کے دو شعری مجموعے اُن کی وفات کے ایک برس بعد بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے شائع کئے۔ جبکہ ان کی بلوچی شاعری کے ایک دیوان کا مسودہ محمد سردار خان گیشکوری کے پاس تھا جس کا پیش لفظ بلوچی کے معروف ادیب امان اللہ گچکی نے لکھا تھا جو بعد میں گم ہوگیا اور اُن کے کئی اشعار کا انگریزی میں ترجمہ، حاجی عبدالقیوم نے کئے تھے جو کاتب کی وفات کے بعد وہ کتاب بھی منظرعام پر نہ آسکا۔۱۳ انہوں نے بلوچی شعری انتخاب، لغت نویسی، تحقیق اور تدوین پر جتنے بھی کام کئے ہیں، ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ ڈرین:

''ڈرین'' بلوچی میں قوسِ قزح کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب بلوچی لوک گیتوں اور اُن کے تراجم پر مشتمل ہے جوانہوں نے عین سلام کے ساتھ مل کر مرتب کی ہے۔ یہ کتاب 175 صفحات پر مشتمل ہے اور بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے 1966ء میں شائع ہوئی ہے۔کتاب میں بلوچی کے تمام لوک اصناف کی شاعری کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جس میں سوت، لاڈوک، ھالو، سپت، لولی، زہیروک، لئیکو، لیلڑی، لیلی مور، ڈیہی اور موتک شامل ہیں۔اس کتاب میں بلوچی لوک گیتوں کے تراجم میں بلوچی بحور اور بلوچی الفاظ و تراکیب کا عمدہ استعمال اردو زبان و ادب کی ترویجی افادیت کو پیش نظر بھی رکھا گیا ہے جو اردو ادب کے لئے ایک سرمایہ سے کم نہیں ہے۔

۲۔ بلوچی نامہ:

یہ اُن کی پہلی اردو تصنیف ہے جو بلوچ معاشرے کی ثقافتی اصطلاحات کی لغت ہے ۔یہ کتاب 197 صفحات پر مشتمل ہے اور اردو سائنس بورڈ لاہور سے جون 1968ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصنیف میں بلوچستان کے مختلف علاقوں کی اہم ثقافتی اصطلاعات اور اُن کے مفاہیم بیان کئے گئے ہیں ۔جس میں رسم و رواج،خانگی زندگی،اشیائے خوردنی، اشیائے ساختگی، متعلقاتِ زمینداری، زراعت، قدرتیات، اور تفریحات سے متعلق اصطلاحات شامل ہیں۔بلوچستان کی سماجی ، معاشی اور تہذیبی قدروں کو اس کتاب میں الگ الگ تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ متعلقہ بلوچی اصطلاعات کے مفاہیم کو ان شعبوں کے پس منظر میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور اس طرح ان میں اردو زبان میں جذب ہونے کی صلاحیت پیداہوگی۔اس کتاب میں فرہنگ کی یوں وضاحت کی گئی ہے کہ بلوچی تہذیب کا ایک مُرقع تیارہوگیاہے اور یہ کتاب نہ صرف لسانی لحاظ سے قابل توّجہ ہے بلکہ بلوچی تہذیب کا ایک نگارخانہ بھی ہے۔

۳۔ جوانسال:

یہ ایک تحقیقی تصنیف ہے جو بلوچی کے ترقی پسند کلاسیکی شاعرابرہیم جوانسال بگٹی کا مجموعہ کلام ہے۔ جوانسال بگٹی کی شاعری عطاشاد نے خود اُن سے سُن کر ریکارڈ کی ہے اور بعد میں انہیں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب 58 صفحات پر مشتمل ہے اور بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے 1968ء میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ اردو بلوچی ڈکشنری:

میرمٹھا خان مری کے ساتھ مل کر انہوں نے بلوچی کے تمام لہجوں پر مشتمل یہ لغت مرتب کی ہے۔اس لغت میں اردو الفاظ کے بلوچی مترادفات مغربی اور مشرقی دونوں لہجوں میں لکھے گئے ہیں۔ اس طریق کار کی بدولت بلوچستان کے کسی بھی خطے کا باشندہ اپنے متعارف لہجے میں اردوالفاظ کے معنی تلاش کرسکے گا۔ بلوچی زبان کے تینوں لہجوں کو شامل کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ اردو دان طبقہ بلوچی کے علاقائی لہجوں سے پوری طرح متعارف ہوسکے گا۔ بلوچی الفاظ کا صحیح تلفظ ذہن نشین کرانے کے لئے حسبِ ضرورت اعراب کا بھی استعمال کیا گیاہے تاکہ پڑھنے والوں کو دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور قاری کے ذہن میں ہرلفظ کا صحیح تصور ابھر سکے۔ یہ لغت 768 صفحات پر مشتمل ہے اور مرکزی اردو بورڈ گلبرگ لاہور سے 1972ء میں شائع ہوئی ہے۔

اس ڈکشنری کی تالیف کے بارے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں''اردو بلوچی ڈکشنری میں نے اور میرمٹھاخان مری نے یکجالکھی لیکن اس کی تکمیل کے پورے عرصے میں ہم کبھی یکجانہیں ہوئے۔ بزرگ ہونے کے حوالے، ہوناتو یہ چاہیے تھا کہ وہ مجھے وقت پر آنے ، اکٹھے بیٹھنے اورلفظوں پر بحث کرنے کی تلقین کرتے یا حکم صادر فرماتے،لیکن انہوں نے کبھی ایسانہیں کیا۔ اردولفظوں کے بلوچی مفاہیم کے الفاظ جتنے انہیں یادہوتے وہ لکھ لیتے اور پھر وہ کاپیاں مجھے بھیجتے، اس پیغام کے ساتھ کہ تم خود لفظ تراش شاعر ہو''۔۱۴

۵۔ ہفت زبانی لغت:

یہ سات زبانوں پر مشتمل ایک لغت ہے جس کے بلوچی کے حصے کو عطا شاد نے ترتیب دی ہے جو اردو سائنس بوڑد لاہور نے شائع کی ہے۔ پاکستانی زبانوں کو تمام علاقوں کے لوگوں کے لئے کارآمد بنانے کی ایک علمی کوشش تھی جس میں اردو، بنگالی، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری اور بلوچی کے الفاظ شامل ہیں۔ لسانیات کی بنیاد پر تحقیق کرنے والے محققین کے لئے یہ ایک نایاب لغت ہے جس میں پاکستان کی تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

۶۔ گشین شاعری:

گشین شاعری کے معنی ہیں منتخب شاعری ۔ یہ کتاب جدید بلوچی شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے جو عطا شاد نے مرتب کی ہے۔ جس میں بلوچی زبان کے جدید شاعری کے ابتدائی دور کے 25 ترقی پسند شعرا کی 65 ترانے، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ یہ تمام شعرا عطا شاد کے ہمعصر ہیں اور بلوچی ادب کے نمائندہ ہیں۔ جن میں میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، سید ظہور شاہ ہاشمی، آزاد جمالدینی، قاضی عبدالرحیم صابر، آدم حقّانی، میر عیسیٰ قومی، محمد رمضان، مراد آوارانی، مراد ساحر، اکبر بارکزئی، عطا شاد، کریم دشتی، اشرف سربازی، صدیق آزاد، مہناز، ملک طوقی، مینگل خان مری، الجوہر خواجہ، بشیر بیدار، امیت ہوت، ہاشم شاکر، مومن بزدار، غوث بخش صابر، پیر محمد زبیرانی، نصیر خارانی شامل ہیں۔ جدید بلوچی شاعری کا یہ انتخاب 157 صفحات پر مشتمل ہے اور 1972ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

۷۔ سنگاب:

اُن کی اردو شاعری کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ فارسی کے لفظ سَنگ اور آب کی ملاپ سے انہوں نے ایک مرکب لفظ کو اپنی کتاب کا نام رکھا ہے۔ 216 صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ نے 1985ء میں شائع کی ہے۔ جس میں عطا شاد کی ابتدائی دور کی شاعری بھی شامل ہے۔ ''سنگاب'' کی اشاعت اُن کی شاعری کی پہچان کا باعث بنا ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر مجتبیٰ حسن نے اس کی اشاعت سے پانچ برس قبل لکھا تھا۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے ''حاصل کے نام'' رکھا ہے ۔ حاصل خان رشتے میں اُن کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

۸۔ برفاگ:

اُردو شاعری کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جو اُن کی وفات کے بعد اُن کے دوست سلطان ارشد قادری نے ناشاد پبلیشرز کوئٹہ کی طرف سے مارچ 1998ء میں شائع کی ہے۔ عطا شاد نے اس کتاب کا نام خود اپنی زندگی میں تجویز کی تھی۔ یہ کتاب 88 صفحات پر مشتمل ہے جس میں عطا شاد کی نامکمل غزلوں کے علاوہ اشعار، نعتیہ کلام، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ اس کتاب کو ان کی شریکِ حیات مِینا کے نام منسوب کر دیا گیا ہے۔

۹۔ شپ سحار اندیم:

بلوچی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جس کے معنی ''رات سحر میں پوشیدہ'' کے ہیں۔یہ کتاب اُن کی وفات کے ایک سال بعد 1996ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع ہوئی ہے۔کتاب عطاشاد نے بلوچی کے معروف نقاد اور اپنے ہمعصر شاعر''کریم دشتی کے نام''منسوب کررکھا ہے۔یہ کتاب 135 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ان کی چالیس سالہ شاعری کا نچوڑ شامل ہے جوانہوں نے عمر کے مختلف مدارج میں لکھے تھے۔جن میں کچھ اشعاران کی لڑکپن کے ناپختہ خیالات ہیں اور کئی اشعارنوجوانی اور کافی نوجوانی کے بعد کی شاعری ہے جونظم،غزل اور گیتوں پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ روچ گر:

بلوچی شاعری کا دوسرا مجموعہ کلا ہے۔جس کا مطلب'' سورج گرہن'' ہے۔ یہ کتاب بھی 1996ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے ہی شائع ہوئی ہے اور133صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا پیش لفظ بلوچی ادب کے ترقی پسند نقاد کریم دشتی کا عطاشادکی شاعری پر لکھا گیا ایک مضمون ہے جو اس کی اپنی کتاب'' شرگداری'' بھی میں شامل ہے۔اس کتاب میں اُن کی مشہور غزلوں کے ساتھ نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں۔

۱۱۔ عطاشاد کے بلوچی ڈرامے:

یہ کتاب عطاشاد کے لکھے گئے بلوچی ڈراموں پر مبنی غیرمطبوعہ ہے جس کی تدوین راقم نے کی ہے۔اس کتاب میں ان کے تمام بلوچی ڈرامے شامل ہیں جو انہوں نے ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں پیش کئے ہیں۔''بلوچی ادب میں ڈرامے کی روایت'' کے عنوان سے لکھا گیا عطاشاد کے ایک مضمون کو اس کتاب کی پیش لفظ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔اس کتاب کی اشاعت بلوچی ادب اورعطاشادکی تصانیف میں ایک نئی اضافت کا باعث بن سکے گا کیونکہ انہیں نہایت کم لوگ بحیثیتِ ڈرامہ نگار جانتے ہیں۔

اعزازات:

اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے انہوں نے نہ صرف خود کوتعمیر کیا بلکہ ریڈیواور ٹیلی ویژن کے کمپیئر، ڈرامہ نگار، مصنف، صداکار پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے بلوچی زبان میں ریڈیو اور ٹی وی نشریات کوسنواراور پروان چڑھایا۔ بلوچی اور اردو زبان کوفروغ دے کر اُن میں جدید اصناف کا اضافہ کرکے بلوچی ادب کا دامن وسیع کردیا۔ ان کی دیگر ادبی خدمات کے اعتراف میں1992ء میں انہیں بدستِ صدرمملکت ستارہ ء امتیاز دیا گیااوراُنہیں بلوچی ثقافت پر تحقیقی کتاب ''بلوچی نامہ'' تحریر کرنے پر 1983ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ڈرامہ نگاری کے خدمت پر انہیں وزرات نشریات حکومت پاکستان کی طرف سے 1984ء میں خصوصی ایواڑ دیا گیا۔ انہیں 1985ء میں انٹرنیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سڈنی آسٹریلیا کی طرف سے''ٹی وی پروڈکشن فیلوشپ'' دیا گیا۔

بیرونی سفر:

سرکاری مصروفیات کے دوران انہوں نے جہاں سماجی اور معاشی بدحالیوں کی صعوبتیں دیکھیں، وہاں قدرت نے انہیں سیروسیاحت کی آزادیوں کی نعمت سے بھی نوازا ۔انہوں نے متعدد ممالک کے سفر بھی کیے۔ یہ سفر سرکاری ضرورتوں کے تحت بھی کیے، سیروسیاحت کی غرض سے بھی ، ادبی مصروفیات کو نبھانے کے لیے بھی کیے اور ذاتی ضرورتوں کی شکل میں بھی کیے۔ان کے کئی سفر سرکاری نوعیت کے تھے جو انفارمیشن کی کورس کے متعلق تھے۔

اپنے پہلے بیرونی سفر میں سابق گورنر بلوچستان، میرغوث بخش بزنجو کے ساتھ 1972ء میں ایک سرکاری وفد کے ساتھ ایران کے دورے پر شامل تھے جس میں وہ اکیلا سویلین آفیسر تھے اور باقی سب اے ڈی سی او ملٹری سیکرٹری تھے۔ اُن دنوں وہ محکمہ اطلاعات ونشریات میں انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر کوئٹہ میں تعینات تھے۔1977ء میں وہ سعودی عرب کی سیر وسیاحت پر گئے۔84-1983ء میں امریکہ کے دورے پر بھی گئے۔1985ء میں ٹی وی پروڈکشن کورس میں ڈپلوما حاصل کرنے کی غرض سے آسٹریلیا گئے جہاں انہیں انٹرنیشنل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے فیلوشپ دی گئی۔ 1987ء میں سرکاری طور پر وفاقی حکومت کی جانب سے حج کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئے۔1989ء میں جرمنی اور تھائی لینڈ کی سیروسیاحت بھی کی۔1993ء میں دومرتبہ اٹلی کا دورہ کیا۔1994ء میں دومرتبہ چین بھی گئے۔اس کے علاوہ انہوں نے برطانیہ، ڈنمارک ، ترکی، عمان، متحدہ عرب امارات اور سنگاپور کی بھی سیر وسیاحت کی ہے۔

اعزازی رُکنیت اور وابستگیاں:

بحیثیت بلوچی اوراردو زبان کے شاعراور ڈرامہ نگار ،عطاشادادبی حلقوں میں نہایت مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور انہیں بلوچستان کے علاوہ پاکستان میں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اُسے بلوچستان کی شناخت کے طور پر بھی پہچانا جاتا ہے ۔ اسی لئے انہیں صوبہ اورملک بھر میں بہت سے ادبی تنظیموں میں اعزازی نمائندگی حاصل تھی ۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک کئی بڑے ادبی تنظیموں سے اعزازی طور پر وابستہ رہے اور اُن کے لئے مختلف ادبی اور ثقافتی پروجیکٹ پر بھی کام کرتے رہے۔ جب پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی گئی تو بلوچستان کی طرف سے عطاشاد اُس کے بنیادی ممبران میں شامل رہے۔ اِسی طرح کوئٹہ میں قلم قبیلہ ٹرسٹ بھی انہیں کی کوششوں کی بدولت قائم ہوا اور وہ اُن کے بنیادرکھنے والوں میں سے ہیں۔ بلوچی اکیڈمی جب کراچی سے کوئٹہ منتقل ہوا تو عطاشاد کی کوشش اورلگن نے اُسے نہایت ہی اعلیٰ مقام پر فائز کرنے میں کردار ادا کیا ،ان کا شمار بلوچی اکیڈمی کے بنیادی ممبران میں کیا جاتا ہے۔ ادارہ ثقافت بلوچستان کو بھی ثقافتی سطح پر فعال کرنے میں عطاشاد کی گہری کاوشیں شامل رہی ہیں ۔بطور ادراہ ثقافت بلوچستان ڈائریکٹر کے وہ اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے اور وہاں پہ نہ صرف اسٹیج ڈرامے منعقد کرواتے رہے بلکہ شعبہ ڈرامہ کے انچارج بھی رہے ،مشاعرے اور دیگر ادبی وثقافتی اور موسیقی کے پروگرام بھی انہی کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے۔

وہ نہ صرف صوبائی ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں بلکہ ملکی سطح پر بھی انہیں اردوزبان و ادب کو فروغ دینے والے

کئی بڑے قومی اداروں کی اعزازی وابستگی حاصل رہی ہے۔ اُنہی قومی ادبی اداروں سے وابستہ ہوکر اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے اپنی صلاحتیں بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ وہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے علاوہ پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، مرکزی اردو بورڈ لاہور، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد جیسے بڑے قومی ادبی اداروں سے تادم مرگ اعزازی طور پر وابستہ رہ چکے ہیں۔

بحثیت ڈرامہ نگار:

نہ صرف اردو اور بلوچی زبان میں وہ اچھے شاعر تھے بلکہ دونوں زبانوں میں ایک تجربہ کار ڈرامہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ڈرامہ نگاری کی ابتداء ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے کی جہاں وہ پروڈیوسر تھے۔ وہ اپنے ریڈیائی ڈراموں کی ہدایت کاری بھی خودکرتے تھے۔ ریڈیو کے علاوہ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ سینٹر کیلئے بھی اردواور بلوچی میں نہایت ہی معیاری ڈرامے لکھے ہیں۔ پی ٹی وی کے لئے لکھے گئے اُن کے ڈراموں میں بلوچی ڈرامہ'' باہوٹ'' کے علاوہ اردو ڈرامہ ''چاکرِاعظم'' جونامور بلوچ سردارمیرچاکرخان رندکی زندگی ،عہدِ سلطنت اور اُن کی میرگوہرام خان لاشاری کے درمیان ہونے والی تیس سالہ خانہ جنگی کے پس منظر میں لکھا گیاہے۔جس نے پاکستان بھر میں پزیرائی حاصل کی ہے۔

اُن کی محنت اور سچی لگن کے باعث ریڈیو پاکستان کوئٹہ اور پی ٹی وی کوئٹہ ڈرامہ کے فن سے نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ انہی کی کوششوں سے فن ڈرامہ نگاری کو ریڈیواور ٹیلی ویژن کے ذریعے بلوچستان میں فروغ حاصل ہوا۔اُن کی اعلیٰ پائے کی ڈرامہ نگاری پرانہیں 1984ء میں وزارتِ اطلاعات ونشریات حکومت پاکستان کی طرف سے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ڈاکٹر عرفان احمد بیگ اُن کی ڈرامہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "1964ء میں عطاشادکویہ اعزازحاصل رہاکہ انہوں نے بحثیت ریڈیوپروڈیوسرکوئٹہ اسٹیشن سے سب سے پہلے بلوچی ڈرامے شروع کئے انہوں نے نہ صرف ریڈیوپاکستان کوئٹہ سے بلوچی ڈرامے پروڈیوس کئے بلکہ ریڈیوکے لئے بلوچی ڈرامے لکھے اور ساتھ ساتھ ہی ان کو یہ کریڈٹ بھی دیاجاتاہے کہ انہوں نے بلوچی ڈرامے بلوچ رائٹرز سے لکھوائے اور بلوچی زبان میں کئی ڈرامہ نگار پیداکئے۔بلوچی کلاسیک داستانوں میں اگرچہ پہلے بہت زیادہ ڈرامائی عنصرموجودتھا لیکن باقاعدہ ڈراموں کا آغازعطاشادنے ریڈیوکوئٹہ سے کیا۔یوں بلوچی ڈرامہ نگاری میں عطاشادکومنفردمقام حاصل ہے۔اوران کا یہ اعزاز ہے کہ انہوں نے بلوچی ڈرامہ نگاری میں پہلے پروڈیوسرہونے کے ساتھ ساتھ معیاری ڈرامہ نگار کی حیثیت سے خودکومنوایااور بلوچی ڈرامہ کی صنف کوبھی منوایا"۔۱۵

اپنے ڈراموں میں انہوں نے بلوچستان کی تاریخ اور بلوچ تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے بلوچی لوک داستانوں کا ڈراموں کے ذریعے حیاء کیا ہے اور انہیں نئی جہت سے پیش کیا ہے۔انہوں نے بلوچستان کے تاریخی شخصیت خان آف قلات میرمحراب خان کی زندگی اورشخصیت پر''میرمحراب خان شہید'' کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے جو ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے نشر ہوچکی ہے۔بلوچی روایات پرمبنی ڈرامہ''نشار'' میں ساس بہو کے تعلقات اور گھریلو

معاملات کو انہوں نے نہایت ہی سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔اُن کا بلوچی ڈرامہ ''لالہ'' بلوچ سماج میں لڑکیوں کی تعلیم اور روشن خیالی کو فروغ دینے کے پس منظر میں پیش لکھا گیا ہے۔

اُن کے بلوچی ڈرامہ'' کیا صدو'' کا مرکزی خیال ایک کلاسیکی عشقیہ داستان سے لیا گیا ہے جو بلوچ معاشرے میں اس سے پہلے صرف ایک روایتی منظوم تمثیل کی شکل میں مشہور تھا۔ جبکہ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں اس ڈرامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' اس ڈرامے کا مرکزی خیال عطاشاد نے اپنی ایک بلوچی نظم ''چرواہا'' سے لیا ہے۔ ۱۶

اس میں کوئی صداقت نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کو بلوچی کلاسیکی داستان'' کیا صدو'' کا علم نہیں تھا۔ اس داستان کا منظوم تمثیل بلوچی کلاسیکل شاعری میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے جو بلوچ معاشرے میں زبان زدعام ہے۔ جس کو بلوچی کے کلاسیکی گلوکاروں نے بہت گایا ہے۔بلوچی رومانس'' کیا صدو'' کو بلوچی ادب میں ایک اہم مقام اس وجہ سے بھی حاصل ہے کہ کلاسیکی شاعری اور کلاسیکل نثر کے علاوہ عطاشاد نے اُس کو ڈرامے کی شکل میں بھی جدید انداز اور نئے اسلوب سے پیش کیا ہے ۔ یوں تو ہر بلوچی کلاسیکل رزمیہ اور بزمیہ منظوم تمثیلات کلاسیکی داستانوں کی شکل میں موجود ہیں لیکن اُن کو ڈرامے کی شکل میں کسی نے پیش نہیں کی ہے۔اُن کی نظم ''شپانک'' جس کے معنی ہیں ''چرواہا'' اس سے ملتا جلتا خیال ضرور پیش کرتا ہے لیکن بلوچی ڈرامہ'' کیا صدو'' اس نظم کے لکھنے سے پہلے کلاسیکی ادب کا حصّہ ہے۔ اسی لیے اُسے عطاشاد کے نظم ''چرواہا'' سے جوڑنا مبالغہ آرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اُس کا بلوچی کلاسیکی ادب منظوم تمثیل اور داستان'' کیا صدو'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تاریخی واقعات اور بلوچی رسوم و روایات اور عام موضوع پر لکھے گئے عطاشاد کے ڈراموں میں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری نہایت ہی مستحکم ہیں۔ انہوں نے ہر تاریخی موضوع کو جدید انداز میں پیش کیا ہے جہاں تک ایسی قدیم رسمیں جو جدید معاشرے میں قابل عمل نہیں ہوسکتیں انہیں نہایت ہی فنکارانہ طریقے سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ایسے رسومات کو سماج کے لئے نقصان دے ثابت کرکے روشن خیالی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔اسی لئے عطاشاد اپنے ہمعصر روایت پرست ڈرامہ نگار اور شعراء کی طرف سے ہمیشہ تنقید کی ضد میں رہا ہے۔عطاشاد کے جدید افکار ، روایت شکنی اور اُن کی تخلیقی صلاحیتیں انہیں دوسرے ہمعصر ڈرامہ نگاروں سے ممتاز رکھتی ہیں۔

بحیثیت گیت نگار:

وہ ایک مکمل فنکارانہ صلاحیتوں کے حامل ادیب تھے۔ انہوں نے نہ صرف ٹی وی اور ریڈیو کے لیے گیت نگاری کی ہے بلکہ اردو کے علاوہ بلوچی اور براہوئی کے لوک دھنوں پر خوبصورت گیت بھی لکھے ہیں ۔جنہیں بلوچستان کے بلند پایہ گلوکار اپنی آواز میں ریکارڈ کرچکے ہیں۔ اُن کے لکھے گئے گیت آج بھی بلوچستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر نشر کیے جاتے ہیں ۔اس کے علاوہ نہایت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے کوئٹہ میں بننے والی پہلی فیچر فلم ''انتقام کی آگ'' کے لئے نغمہ نگاری بھی

کی ہے۔اسی فلم اور عطاشاد کی فلمی گیت نگاری کے متعلق محمد قاسم خان عزمی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ساٹھ کی دہائی میں کوئٹہ کے چند نوجوان فنکاروں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک فلم ''انتقام کی آگ'' کے نام سے ہدایت کار، کہانی نویس عبدالرزاق خان کی سربرائی میں بنائی تھی ۔ موسیقار خدائے رحیم کے کہنے پر عطاشاد کو بطور گیت نگار اس فلم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔عطاشاد نے اُس فلم کے لیے چار گیت لکھے تھے جن میں سے تین گیت نگہت سیما کی آواز میں خدائے رحیم کی ترتیب دی گئی موسیقی اور اُن کی دھنوں میں ریکارڈ ہوئے تھے جن کے بول یہ تھے۔

1۔ دل کے ویرانے

2۔ یہ بھیگی بھیگی رات

3۔ ہائے میرا دل

عطاشاد کا لکھا گیا چوتھا گیت افغانستان کے مشہور گلوکار ناشناس کی آواز میں خدائے رحیم کی ترتیب دی گئی دھن پر ریڈیو اسٹیشن کابل میں ریکارڈ کیا گیا۔ جس کی موسیقی میں کابل کے مشہور سازندوں نے حصّہ لیا تھا۔ ناشناس کے گائے ہوئے اس گیت کو موسیقار خدائے رحیم پر ہی فلمایا گیا تھا جس کے بول تھے۔

''غمِ محبت، غمِ زمانہ، ہزار تیر، ایک دل نشانہ''

نگہت سیما کے گائے ہوئے نغموں کی نسبت ناشناس کا گایا ہوا گیت زیادہ مشہور ہوا تھا، جو اُس دور میں ہوٹلوں پر بجنے والا مشہور گیت تھا۔ جو آج بھی کیسٹ کی صورت میں سُنا جاتا ہے۔ اِس طرح عطاشاد کا لکھا ہوا ایک فلمی نغمہ روزِ اوّل کی طرح آج بھی مشہور ہے''۔۱۷

اُن کے لکھے گئے گیت آج بھی بلوچستان میں مقبول عام ہیں ۔ گیت نگاری کا شوق انہیں اُس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے بلوچی فوک گلوکاروں کے لیے گیت نگاری بھی کی ہے اور نئی دھنیں بھی خود تخلیق کی ہیں۔ ان کے بے شمار گیت آج بھی اُسی طرح پسند کیے جاتے ہیں جس وقت ریڈیو پاکستان میں اُن کی وابستگی کے دوران پسند کیے جاتے تھے۔ انہوں نے مشہور بلوچی دھنوں پر ازسرنو اردو میں بھی گیت نگاری کی ہے۔

عطاشاد سے منسوب ادارے و مقامات:

عظیم شخصیات کے نام مقامات اور اداروں کو منسوب کرنے کی روایتیں بہت پرانی اور تاریخی ہیں۔ جس کا مقصد اُن سے عقیدت و محبت کا اظہار اور ان کے علمی، سماجی، سیاسی ، قومی ،مذہبی ،تاریخی اور ادبی کارناموں کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں قومی شخصیات سے عقیدت و احترام کرکے گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر پر بڑے بڑے اداروں ، سڑکوں اور تفریحی مقامات کو اُن کے ناموں سے منسوب کی جاتی ہیں۔تاکہ اُن کی کارکردگی کو زندگی بھر نیک تمناؤں کے ساتھ

رہتی دنیا تک یاد کیا جاسکے۔ عطاشاد بلوچستان کے اُن عظیم شخصیات میں سے ہیں کہ گورنمنٹ آف بلوچستان اور عوام نے اُن سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرکے اُن کے نام کچھ ادارے منسوب کررکھے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ عطاشاد آڈیٹوریم ادارہ ثقافت، بلوچستان:

پہلی مرتبہ 1982ء تا1986ء اور دوسری مرتبہ 1989ء تا1990ء میں وہ بطور صوبائی سیکرٹری کھیل و ثقافت کی حیثیت سے اپنے سرکاری فرائض سرانجام دے چکے تھے۔ اورادارہ ثقافت بلوچستان میں خاص مواقع پر محفل موسیقی، مشاعرے اور دیگر ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کرکے ادارے کو کافی فعال بنا چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں دوستوں کے ساتھ ہر وقت بیٹھ کر نجی، ادبی اور علمی مجالس سجایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد صوبائی گورنمنٹ نے ان کے اعتراف فن اور ادارے کے لئے اُن کی قربانیوں اور ذمہ داریوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ادارہ ثقافت بلوچستان کوئٹہ کی عمارت کے اندر موجود ہال کو عطاشاد کے نام سے منسوب کرکے اس کا نام عطاشاد آڈیٹوریم رکھ دیا ہے۔ ادارہ ثقافت کی عمارت کوئٹہ میں جناح روڈ پر واقع ہے اور اُس کے عقب میں شاہرہ عدالت پر بلوچی اکیڈمی کی عمارت واقع ہے۔

۲۔ عطاشاد ڈگری کالج، تربت:

تعلیمی اداروں کو معروف شخصیات کے نام منسوب کرنے کی روایتیں ہر ملک میں موجود ہیں۔ اسی طرح گورنمنٹ آف بلوچستان نے عطاشاد کی وفات کے کچھ سال بعد ضلع کیچ کے واحد ڈگری کالج کا نام گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج سے تبدیل کرکے عطاشاد کے نام منسوب کردیا ہے۔ جس کو ایک تاریخی کارنامہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے شہر کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کو اُن کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ جس سے گورنمنٹ آف بلوچستان کی عطاشاد سے عقیدت کا پتا چلتا ہے۔ یہ کالج تربت کا سب سے پرانا تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں گریجویٹ تک تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے اس کالج میں اساتذہ کی رہائش گاہیں، طلبہ کے ہاسٹلز اور کھیل کے میدان بھی ہیں۔ گورنمنٹ عطاشاد ڈگری کالج تربت، پسنی روڈ پر واقع ہے۔

۳۔ عطاشاد روڈ، کوئٹہ:

وہ کوئٹہ کے جس سرکاری رہائشگاہ میں قیام کرچکے ہیں وہ انسکمب روڈ پر واقع ہے۔ جہاں کوئٹہ کے کمشنر، ڈپٹی کمشنر سمیت تمام صوبائی سیکرٹریوں اور بیوروکریٹس کی رہائش گاہیں واقع ہیں۔ عطا شاد سکریٹری کے عہدے سے لے کر وفات تک اسی روڈ پر رہائش پزیر رہے۔ اُن کی وفات کے کئی عرصے بعد اُن کے قریبی دوستوں نے اپنی طرف سے اُس روڈ کا نام عطاشادروڈ رکھ دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وہاں ایک عرصے تک رہائش پزیرہ چکے تھے۔ چونکہ سرکار کی طرف سے باقاعدہ طور پر انسکمب روڈ کو عطاشاد کے نام منسوب کرنے کا اعلان نہیں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے یہ روڈ عطاشاد کے نام سے زیادہ انسکمب روڈ کے نام سے مشہور ہے اور وزیراعلیٰ ہاؤس کے عقب میں واقع ہے۔

۴۔ عطاشاد اکیڈمی ،تربت:

اُن کے آبائی علاقے سنگانی سر کے چند اہلِ قلم نے 2004ء میں شوکت حیات کی سربراہی میں بلوچستان اکیڈمی تربت سے علیحدگی اختیار کر کے ان سے اپنے دلی عقیدت کا اظہار کر کے اُن کے نام سے ایک ادبی اکیڈمی قائم کی جو ،ہر سال عطاشاد کی برسی عقیدت و احترام کے ساتھ مناتی ہے۔جس کے ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں جن میں تربت اور گردنواح کے شاعراور ادیب شرکت کر کے اپنی تخلیق پیش کرتے ہیں۔تربت میں بلوچی ادب کو فروغ دینے کے لیے عطاشاد اکیڈمی کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں۔عطاشاد اکیڈمی تربت کے زیراہتمام ایک ماہانہ بلوچی رسالہ'' مچکدگ'' کے نام سے شائع ہورہی ہے۔عطاشاد اکیڈمی تربت شہر کے وسط میں واقع ہے۔

۵۔ عطاشاد پارک ،تربت:

اُن کی وفات کے ایک سال بعد1998ء میں ضلع کیچ میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے تعینات نامورادیب عبدالکریم بریالے نے عطاشاد کے اعتراف فن اور اُن کی ابدی یادیں تازہ کرنے کے لیے ایک پارک کو ان کے نام منسوب کرلیااوراُس کا نام عطاشاد پارک رکھ دیا۔ پہلے یہ پارک ایک تفریح گاہ کی حیثیت اختیار کرچکا تھا لیکن تربت میں دوسرے شہروں کی طرح تفریح کا رجحان نہ ہونے کے باعث جلد ہی اُس کی رونقیں ماند پڑگئیں اوران کے جھولے اورتفریح کی غرض سے لگائے گئے دیگرقیمتی اشیاء وہاں سے غائب ہوگئے۔پانچ سال قبل تربت شہر کے مضافاتی علاقوں میں سیلاب سے متاثرین خاندانوں نے آکروہاں جگیاں تعمیر کر کے غیرقانونی رہائش اختیار کرلی۔ اس کے بعد بلوچستان اکیڈمی تربت نے ایک صوبائی وزیر کے توسعت سے وہاں ایک ہال تعمیر کرلیا اور اسی طرح عطاشاد سے منسوب اس پارک پر بلوچستان اکیڈمی تربت نے اپنا باقاعدہ قبضہ جمالیا۔عطاشاد پارک تعلیمی چوک کے قریب پسنی روڈ پر واقع ہے۔

۶۔ عطاشادانگلش لینگویج سنٹر، تربت:

کسی بھی ادارے کا نام کسی عظیم شخصیت کے ساتھ منسوب کرنے کا مقصد یا تو ادارے کوفعال اورمشہور بنانا ہوتا ہے یا پھر اُس عظیم شخصیت سے عقیدت رکھنے کی غرض سے یا پھر قوم پرستی کے نظریے کے پیش نظر اداروں کے نام اُن سے منسوب کیے جاتے ہیں۔گزشتہ آٹھ برسوں سے تربت میں انگلش لینگویج سنٹر کے قیام اور انگریزی زبان کی تعلیم کا ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے۔اور بے شمارانگلش سنٹرزانگریزی ناموں کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ تین برس پہلے عطاشاد سے عقیدت رکھنے والے چندطلباء نے تربت شہر کے مضافاتی علاقہ میں اپنی مدد آپ کے تحت ایک نیا انگلش لینگویج سنٹر قائم کیا اوراُس کا نام عطاشاد انگلش لینگویج سنٹر رکھ دیا۔ عطاشاد کے نام منسوب انگریزی زبان کی تعلیم وتربیت کا یہ سنٹر چاہسر میں ائیرپورٹ روڈ پرواقع ہے

۷۔ تجویزِ عطاشاد یونیورسٹی، کیچ:

اُن کے نام کوئی بھی یونیورسٹی منسوب نہیں ہے البتہ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اپنی رسالہ ماہنامہ سنگت فروری 2000ء کے اداریہ میں گورنمنٹ کو ایک تجویز پیش کی ہے۔جس میں انہوں نے عطاشاد کے آبائی شہر تربت میں ان کے نام ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے عمل پر زور دیا ہے .اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں'' بلوچستان میں اعلیٰ تعلیم کی شرح خواندگی نہ ہونے کے برابر ہے اور کوئٹہ میں قائم بلوچستان یونیورسٹی مکران سے بہت فاصلے پر ہے اور وہاں کے طلباء کو یہاں پڑھنے کے لیے کافی خرچے اٹھانے پڑھتے ہیں۔اکیسویں صدی میں جدید موضوعات کے سامنے آنے سے فرسودہ شعبوں کا خاتمہ ہونا چاہیے ۔نئی اور جدید تعلیمی مضامین جس کے باعث دنیا کا نقشہ بدل گیاہے انہیں شامل کرنا چاہیے''۔۱۸ وہ عطاشاد سے منسوب ایک نئی یونیورسٹی کا قیام کو وقت کا تقاضے قرار دیتے ہوئے زور دیتے ہیں اور اُسے ضلع کیچ کی اشد ضروری خیال کرتے ہیں۔اُن کا خیال ہے کہ بلوچستان کے دیگر تمام علاقوں کی نسبت سے مکران زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور وہاں ایک اچھا تعلیمی رجحان اور ماحول پایا جاتا ہے۔اور وہاں کے لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔وہ پڑوس میں خلیجی مما لک کی موجودگی اور وہاں مکرانی بلوچوں کی ایک بڑی اکثریت کی رہائش پذیری اور اُن کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی کمی کی ضرورت کومحسوس کرتے ہیں۔اور ایرانی بلوچستان کے لوگوں کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کو بنیادی وجہ بتا کر عطاشاد یونیورسٹی کیچ کو یک اہم اور بنیادی ضرورت قرار دیتے ہیں۔

عطاشاد کا شمار کہنہ مشق بیوروکریٹس ،محققین اور شعراً میں ہوتا ہے اُن کی سوانح حیات اور خدمات بہت سی خصوصیات اور خوبیاں سے بھرپور ہے، انہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر اوقات لوگوں میں خوشیاں اور محبتیں بانٹنے میں گزارے ہیں اور اُن کے اپنے حصّے میں کم خوشیاں اور محبتیں آئی ہیں۔جس طرح اُن کی خدمات پُر اثر ہیں اُسی طرح اُن کی سوانح حیات بھی مختلف النوع خوشیوں اور اذیّتوں سے عبارت ہے۔اُن کی سوانح حیات،خدمات اور شخصیت کے پہلو اس قدر وسیع ہیں کہ اُن پر مزید تحقیق کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ م۔ک پیکولن، ترجمہ، شاہ محمد مری، ڈاکٹر'' بلوچ'' لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۶ء، ص،۳۴۔

۲۔ انٹرویو، پروین شاکر'' عطاشاد سے مکالمہ'' مشمولہ، سہ ماہی دستگیر شادنامہ، کوئٹہ، س ن، ص،۸۴۔

۳۔ عبدالحمید لعل محمد بلوچ'' عطاشاد یادوں کی بارات'' مشمولہ، ماہنامہ بلوچی دنیاملتان، عطاشاد نمبر، فروری ۱۹۹۸ء، ص،۳۴۔

۴۔ عارف قریشی'' عطاشادءَ گوں اوّلی ملاقات'' مشمولہ، ماہتاک بلوچی کوئٹہ، عطاشاد نمبر، جون ۱۹۹۸ء، ص،۱۸۹۔

۵۔ عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر عطاشاد شخصیت اور فن پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی: اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص،۳۳۔

۶۔ حسن اختر بلوچ'' عطا شاد امر ہوگیا'' مشمولہ، ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، عطا شاد نمبر،فروری ۱۹۹۸ء،ص،۳۹۔

۷۔ انٹرویو، پروین شاکر'' عطا شاد سے مکالمہ'' مشمولہ، سہ ماہی دستگیر شادنامہ،کوئٹہ،س ن،ص،۵۷۔

۸۔ اختر علی خان بلوچ'' عطا شاد'' مشمولہ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، عطا شاد نمبر،فروری ۱۹۹۸ء،ص،۴۷۔

۹۔ عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر عطا شاد شخصیت اور فن پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوعہ،ص،۳۳۔

۱۰۔ ایضاً،ص،۸۲۔

۱۱۔ ایضاً،ص،۸۴۔۸۵۔

۱۲۔ ایضاً،ص،۸۵۔۸۶۔

۱۳۔ عطا شاد، پیش لبز شپ سحار اندیم کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی،طبع اوّل،۱۹۹۶ء،ص،۱۳۔

۱۴۔ عطا شاد'' دستار اور اعتبار کا سورج'' مشمولہ، ماہنامہ قومی زبان،کراچی: دسمبر ۱۹۸۷ء،جلد:۵۸،شمارہ:۱۲،ص،۲۱۔

۱۵۔ عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر عطا شاد شخصیت اور فن پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوعہ،ص۱۶۲۔۱۶۵۔

۱۶۔ یضاً،ص۱۶۸۔

۱۷۔ محمد قاسم خان عزمی'' کوئٹہ میں بننے والی واحد فلم کے نغمہ نگار'' مشمولہ، سہ ماہی دستگیر شادنامہ،ص،۲۰۳۔۲۰۴۔۲۰۵۔

۱۸۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر'' اداریہ سنگت'' مشمولہ، ماہنامہ سنگت،کوئٹہ،عطا شاد نمبر،فروری ۲۰۰۰ء،ص،۷۔